Date of Publication: 16-05-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 May 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 May 2013
Issue: 20, Vol.: 72

۲۲ تا ۲۸ مئی ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۲۰، جلد نمبر: ۷۲

پہلی قسط

ایک انوکھی فن کارہ لیلا نائیڈو

وشوناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا [یوپی] 201303)

قریب نصف صدی قبل کی بات ہے، بمبئی کے روپ تارا اسٹوڈیو میں منگل مووی ٹون کے پرچم تلے بننے والی فلم ساز آر ایل سوری کی ایسٹ مین کلر فلم 'باغی' کی شوٹنگ چل رہی تھی جو عربین نائٹس (Arabian Nights) ٹائپ کی ایک تصوراتی اور طلسماتی فلم تھی اور جسے 'حسینہ آف بغداد' جیسی فلموں کی طرز پر بنایا جا رہا تھا، گویا ایک طرح سے یہ عربی پس منظر میں بنائی گئی ایسی فینٹسی پکچر تھی جس میں مار دھاڑ، شمشیر زنی، خنجر آزمائی، نیم عریاں حسیناؤں کے مسلسل کے مناظر، سیکسی گروپ ڈانس، کشت و خون اور بے تکی سی مزاح نگاری پیدا کر کے باکس آفس کا پورا مسالہ بھر دیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی فلمیں اگر زیادہ کامیاب نہ ہوں تو بھی اپنی اصل لاگت وصول کر لیتی ہیں اور پروڈیوسر کمانے میں نہیں رہتے۔

فلم 'باغی' میں مرکزی کردار لیلا نائیڈو اور پردیپ کمار ادا کر رہے تھے جب کہ ممتاز معاون ہیروئن کا رول نبھا رہی تھی۔ رام دیال اس فلم کے ہدایت کار تھے جن کی درمیانہ بجٹ کے ذریعے بنائی گئی فلمیں تجارتی اعتبار سے عموماً کامیاب رہتی تھیں۔ اس سے پہلے وہ مدراس میں جے للتا (جو اس وقت تامل ناڈو کی چیف منسٹر ہیں) کو لے کر ایک ایڈونچر ہندستانی فلم بنا چکے تھے جس میں موصوفہ چابک ہاتھ میں لے کر گھوڑے کی سواری کرتی اور لٹیروں کے خلاف معرکہ آرائی کرتی دکھائی گئی تھیں۔ تب جے للتا جوان اور خوب صورت تھیں اور انھیں تمل فلموں کی اے کلاس ہیروئن تصور کیا جاتا تھا۔ یہ فلم تجارتی اعتبار سے ہٹ ثابت ہوئی تھی اور اس نے انڈسٹری میں رام دیال کے نام کو چمکا دیا تھا۔ میں ان دنوں بمبئی میں اپنے معمول کے فلمی سفر پر تھا اور نگار خانوں میں جا کر فلم اسٹاروں سے ملتا تھا اور ان کی سرگرمیوں کی نئی خبریں حاصل کرتا تھا۔ میں جب روپ تارا اسٹوڈیو میں پہنچا تو 'باغی' کے سیٹ پر موجود بھی فن کار بڑے مسرور نظر آ رہے تھے کیوں کہ اس سے پہلے وہ ایک منظر بڑی کامیابی کے ساتھ پکچرائز کر چکے تھے اور اب دوسرا سین فلمانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہدایت کار رام دیال سے میری جان پہچان تھی۔ میں مصافحہ کرنے کے بعد اُن سے فلمی گفتگو کرنے لگا۔ لیلا نائیڈو تھوڑے فاصلے پر بیٹھی اپنے اگلے سین کے مکالمے یاد کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ دو فلموں 'انورادھا' اور 'یہ راستے ہیں پیار کے' میں کام کر چکی تھی لیکن اُس روز میں آج پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ پردے پر وہ جتنی خوب صورت دکھائی دی تھی اُس سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ اُس کی ریشمی زلفیں اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور اپنے مکالمے یاد کرنے میں مگن تھی۔ میں نے ملنا اور بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور رام دیال سے بات چیت میں لگا رہا۔ نظر بھی کبھی لیلا کی ہوا میں اڑتی ہوئی زلفوں پر ضرور جا لگتی تھی۔

پیشتر اس کے کہ لیلا نائیڈو کا ذکر تفصیل سے آئے، میں یہاں ڈائرکٹر رام دیال کے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ رام دیال فلمی دنیا کی ممتاز ہستی اور نامور ایڈووکیٹ دیوان سرداری لال کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اُن کے چھوٹے صاحبزادے چاند صاحب بھی ایک مقبول فلم ساز اور ہدایت آموز تھے۔ دیوان سرداری لال حصول آزادی سے قبل لاہور کے فلمی حلقے کی ایک مانی ہوئی شخصیت تھے اور وہ سیٹھ دل سکھ ایم پنچولی کے فلم اسٹوڈیو کے جنرل منیجر تھے۔ انھیں بڑی عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ دیوان صاحب لاہور کی مشہور اور حسین و جمیل اداکارہ آشا پوسلے (اصلی نام: خورشید بیگم) کے ساتھ پیار کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ چاہت اتنی شدید تھی کہ لمحہ بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دیوان صاحب ۱۹۴۷ء کے بٹوارے کے ہیبت ناک فسادات کے باوجود آشا پوسلے کے عشق کی خاطر لاہور میں ٹکے ہوئے تھے۔ سیٹھ دل سکھ ایم پنچولی لاہور سے رخصت ہوتے وقت دیوان سرداری لال کو اپنے فلم اسٹوڈیو کا انچارج بنا کر چابیاں اُن کے ہاتھ میں سونپ آئے تھے۔ دیوان صاحب چار سال تک تو وہاں ٹکے رہے، اس کے بعد مفسدوں نے انھیں تنگ کرنا شروع کر دیا اور تقاضا کرنے لگے کہ وہ لاہور چھوڑ کر ہندستان چلے جائیں۔ بے چاری آشا پوسلے نے انھیں روکنے کے لیے اپنا پورا زور لگایا مگر طوفان تھما نہیں۔ دیوان صاحب 'ہمت مرداں مدد خدا' کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے پھر بھی جمے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں نہرو لیاقت معاہدے کے بعد جب فلم اسٹار پران اور اوم پرکاش اپنی فلم 'مداری' کی ریلیز کے لیے لاہور گئے تب بھی دیوان سرداری لال پنچولی اسٹوڈیوز کے جنرل منیجر تھے اور انھوں نے اپنے اسٹوڈیو میں ان دو مہمانوں کا شاندار استقبال کیا تھا اور ضیافت دی تھی۔ اس کے چند ماہ بعد حالات اس قدر ناساز گار ہوئے کہ دیوان صاحب کو بادل نخواستہ ہجرت کر کے ہندستان آنا پڑا جہاں بمبئی میں ان کے پرانے دوست اور رفقا پران، اوم پرکاش، امرناتھ، رندھیر، مجنوں، ہتیش اور رام لال پہلے سے موجود تھے۔

دیوان صاحب نامی گرامی وکیل تھے۔ بات قریب پچپن چھپن سال پرانی ہے، فلم ہیروئن ثریا نے دلّی کے مشہور کثیر الاشاعت فلمی و ادبی میگزین 'شمع' کے چیف اڈیٹر جناب یوسف دہلوی، مدیر جناب یونس دہلوی اور فوٹو اڈیٹر جناب ادریس دہلوی کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ 500/109 کے تحت بمبئی پریذیڈنسی مجسٹریٹ مسٹر آر ایس پارکھ کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ یہ مقدمہ رسالہ 'شمع' کی مئی ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں ثریا کی تصویر کے ساتھ ایک خبر کے عنوان کی شکل کے ضمن میں تھا۔ ثریا کی طرف سے مسٹر ایچ پی ڈیسائی اور مسٹر اے ایچ ڈیسائی پیش ہوئے جب کہ 'شمع' کی جانب سے مسٹر نورالدین احمد، مسٹر سیداے ایم برٹ، مسٹر ڈی ڈی مدتانی اور دیوان سرداری لال بطور وکیل صفائی پیش ہوئے تھے۔ اخبارات میں بہت دنوں تک اس مشہور مقدمے کا ذکر ہوتا رہا۔

دیوان سرداری لال نے اپنے لاہور کے پرانے فلم جرنلسٹ دوست پروڈیوسر ڈائرکٹر جناب بی آر چوپڑا کے ساتھ بھی کام کیا۔ وہ چوپڑا صاحب کی ڈائرکشن میں بننے والی کورٹ روم ڈرامہ فلم 'قانون' میں قانونی مشیر تھے اور فلم کے کریڈٹ ٹائٹل میں نمایاں طور پر ان کا نام دیا گیا تھا۔ رام دیال کی ایک فلم 'دورانا' (رنگدار) نے زبردست شہرت حاصل کی تھی جس کی ہیروئن نوآموز رادھا سلوجہ تھی اور جس کے بولڈ مناظر نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بعد ازاں رام دیال نے ایک اور فلم 'دو نمبر کے امیر' اسی طرز پر بنائی لیکن سینسر بورڈ

نے اس پر بُری طرح قینچی چلائی اور فلم فلاپ ہوگئی۔

جن دنوں فلم 'یادگی' زیر تشکیل تھی تو فلمی پریس میں پرنس احمد کے ساتھ لیلا نائیڈو کے رومانس کے چرچے زوروں پر تھے۔ نہ جانے پرنس احمد کس ریاست کے ولی عہد تھے اور اس عشق کا پس منظر کیا تھا۔ بہرحال لیلا نے اس رومان کی تردید کی تھی اور اسے محض ایک اخباری گپ قرار دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ بے بنیاد افواہ اپنے آپ ختم ہوگئی۔

لیلا نائیڈو ۱۷؍فروری ۱۹۴۰ء کو بمبئی کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کے والد ڈاکٹر رمیا ساناتھ کے رہنے والے تھے اور سائنس داں تھے۔ گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی اس لیے بڑے ناز ونعم سے اس بچی کی پرورش ہوئی۔ ماں فرنچ (French) تھی اس لیے بچی سچ مچ ہندوستانی اور فرنگی حسن کا خوب صورت امتزاج تھی۔ اس کی مادری زبان فرانسیسی تھی اس لیے اس پر مغربی تہذیب کا اثر نمایاں تھا۔ شروع شروع میں وہ انگریزی زبان سے ناآشنا تھی۔ اس کی عمر آٹھ برس کی تھی جب وہ ۱۹۴۷ء میں لندن چلی گئی۔ اس نے کچھ سال وہاں انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد یہ کنبہ جنیوا (سوئٹزر لینڈ) منتقل ہوگیا جہاں اس کے والد انجمن اقوام متحدہ (UNO) کے ثقافتی اور سائنسی ادارے یونیسکو میں سائنس ڈائرکٹر تھے اور یہ ایک اہم عہدہ تھا۔ لیلا نے جنیوا کے انٹرنیشنل اسکول میں داخلہ لیا۔ وہاں وہ آٹھ برس تک زیر تعلیم رہی۔ یہ اس کی زندگی کا بہترین وقت تھا۔ وہ اس اسکول کے ڈرامیٹک سیکشن کی سرگرم رکن رہی اور ہر سال پبلک پرفارمینس دیا کرتی تھی۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے سوئٹزر لینڈ کے مشہور ڈائرکٹر جارج سائمن کی وساطت سے "THE GIRL WHO WANTED TO EQUAL THE GODS" نامی فلم میں کام کیا۔ یہ فلم کینز کے فلم فیسٹول میں مقابلے کے لیے بھیجی گئی جہاں اسے بہترین فوٹو گرافی اور اداکاری پر ایوارڈ ملا تھا۔ سوئٹزر لینڈ میں اس نے شیکسپیئر، مولیئر اور ریسائن کے ڈراموں میں کام کیا۔ چودہ برس کی عمر میں اس کا ارادہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے تھیٹر ڈپارٹمنٹ میں شامل ہونے کا تھا مگر اسے چانس نہ مل سکا کیوں کہ اس کے والد کی ٹرانسفر انڈیا میں ہوگئی جہاں وہ بھارت سرکار کے یونیسکو کے محکمہ جات کے صلاح کار کے طور پر کام کرتے رہے۔ لیلا اس لیے ہمیشہ یورپ کی ممنون رہی کہ اس نے وہاں رہ کر ڈسپلن اور کچھ کام کرکے دکھانے کی اسپرٹ حاصل کی۔ یورپ میں رہتے ہوئے اس نے فلم ڈائرکٹر سیلے مون بھوانی اور ڈیبوِڈ کیتھری فاکس کے اشتراک میں بننے والی فلم FLAME OF THE FOREST میں بھی رول ادا کیا۔ ایڈورڈ ڈیمک نے فلم 'دی فاؤنٹین ازبگ' میں کام دیا۔ کلسو میکڈونی نے بھی اس سے کنٹریکٹ کیا۔ پیرس میں وہ انگرڈ برگمین اور گریٹا گاربو سے بھی ملی

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

دوسری قسط

دانش وروں کا رول

ایڈورڈ سعید
انگریزی سے ترجمہ: صدیق الرّحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز

ساری رائیں کسی نہ کسی مخصوص نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی بنا پر Mill کہتا ہے کہ "یہ سیاست ہی کی دنیا ہے جہاں ذہنی اتحاد اور ساری کوششوں کو لازماً مجتمع ہونا چاہیے"۔ مزید براں اگر کوئی سوچنے والا خود کو سیاسی جدوجہد میں حق گوئی کی قدر سے وابستہ نہ کرے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ زندگی کے پورے تجربے کے ساتھ ذمے دارانہ طور پر نباہ کرسکے۔ ہم میں متضاد، متصادم اور حاوی ہوجانے والے عصری وسائل ترسیل سے سچائی کو نچوڑ لینے کی صلاحیت ضرور ہونی چاہیے اور صرف وسائل ترسیل ہی نہیں بلکہ اس پوری دنیا کو بھی جس سے ہمارا سابقہ ہے، اسی طرح برتنا چاہیے۔

ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ اُن خیالات پر بھروسہ کرتی ہے جو اس نے اوروں سے پائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں) "ہمارا یہی طریقہ ہے، یہی تو ہوتا آیا ہے۔ ان ہی سب باتوں کے مطابق ہمیں بھی رہنا چاہیے" اور میرے نزدیک تو دانش ور کا رول یہ ہے کہ مدتوں سے قائم رہنے والی باتوں کے بارے میں سوال کرے۔ جن لوگوں کے پاس اقتدار ہے انھیں چیلنج کرے، خبروں کی سطح پر جو کچھ نظر آتا ہے اس کی تہ میں اُترے، حکومت کی رپورٹوں کی گہرائیوں میں جائے اور جو کچھ اسے علم اور اختیار کے نام پر دیا جاتا ہے اس کی سطح کو بھی پار کرکے اندر دیکھے۔ غرض یہ کہ یہ سارا عمل طالب علمی کے وقت سے ہی شروع ہوتا ہے اور جب وہ ایک سماج کا ایک شہری بن جاتا ہے تو یہی عمل جاری رہتا اور یہی سب کچھ کرتے رہنا ہی سچائی سے آشنا ہوتا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ مسائل کیا ہیں جو دانش وروں کے لیے مخصوص ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ کیا ہر شخص دانش ور کہلانے کا مستحق ہے یا یہ صرف چند لوگوں ہی کی میراث ہے۔

اٹلی کا عظیم مارکسٹ گرامچی (Gramshe) جو بیسویں صدی کا وہ پہلا مفکر تھا جس نے دانش وروں کے بارے میں لکھا، اس نے کہا تھا کہ ہر انسان ایک دانش ور ہے کہ اس کے پاس عقل ہوتی ہے۔ مگر ہر شخص سماج میں دانش ورانہ کام انجام نہیں دیتا اور ایک دوسرے یورپی مفکر جولین بنڈا (Julian Benda) نے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے، ۱۹۲۰ء کے عشرے کے آخر میں Betrayal of the Intellectual (دانش ور کی غداری) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے کہا کہ دانش ور تعداد میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں کیوں کہ اصل دانش ور تو وہی ہے جو ایک طرح کا Outsider (اجنبی) ہوتا ہے جو سوالات کرتا ہے اور مانی ہوئی باتوں کو کچھ اس طرح چیلنج کرتا ہے جس طرح اس سے پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔

چناں چہ دانش ور دراصل عہد نامۂ قدیم کے ایک پیامبر کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی طرح کوئی دوسرا نہ سوال کرنا چاہتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اُسے جواب دینا چاہتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دانش ور کسی شخص کا نہیں بلکہ زندگی کی طرف ایک رویے کا نام ہوتا ہے۔ وہ بہ نفس نفیس زندگی کی ایک خاص نوعیت کی نمائندگی کرتا ہے وہ خود ایک سوال ہے۔ وہ ایک قوت ہے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اُسے سب سے زیادہ دل چسپی سچائی کے اظہار سے ہے۔ جن چیزوں کو دوسرے لوگ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے انھیں اسی طرح قبول کرلیتے ہیں جیسی کہ وہ پاتے ہیں۔ دانش ور ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب خاص طور سے یہ دیکھنا ہے کہ آج کے دانش ور کو کن مسائل کا سامنا ہے۔ وہ کیا شے ہے جو دانش ور کو اپنا اصل مقام حاصل کرنے سے روکتی ہے۔ میرے خیال میں دانش ور کی راہ میں سب سے پہلی رکاوٹ تو وہ بوجھ ہے جو روایت اور اس کی قوم اس پر لادے ہوئے ہوتی ہے۔ ہر نظام تعلیم، ہر ملک، اس کے اساتذہ، اس کے طلبہ، زبان اور قومی زبان، طالب علموں کو ان کے پس منظر، ان کی نسل، ان کی وراثت، ان کی روایات اور ریاست کے شہری کی حیثیت سے ان کو ان کے عہد گزشتہ کی شناخت کا درس دیتی ہے۔ چناں چہ ہندستانی طالب علم ہندستان کا مطالعہ کرتے ہیں اور ایک دوسری سطح پر، جیسا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہے، وہ خصوصی طور پر اس ورثے کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہندستان کے تناظر میں اسلام سے مخصوص ہے۔

دنیا کے اس خطے میں جہاں سے میرا تعلق ہے ہم ایک زبردست مباحثے میں مصروف ہیں اور وہ یہ ہے کہ روایت سے مراد کیا ہے؟ ایک روایت تو وہ ہے جو ہمیں اپنے مقامی کلچر سے ورثے میں ملتی ہے ـــ ہر شخص کو اس کے بعد اگلا سوال ملک سے وفاداری اور حب الوطنی کا ہے۔ مجھے اٹھارھویں صدی کے انگریزی کے عظیم لغت نویس فلسفی، ناول نگار اور شاعر ڈاکٹر جانسن کا قول یاد آتا ہے جن کا کہنا تھا کہ "حب الوطنی بدمعاشوں کی آخری پناہ گاہ ہے" جس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ کو یہ پتا نہ ہو کہ کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے تب آپ کہتے ہیں: "میرا ملک غلط ہو یا صحیح میں اس کے ساتھ ہوں۔ پھر اس کے ساتھ جب آپ کو یہ بھی نہ پتا ہو کہ کیا کہنا ہے اور کدھر جانا ہے تو آپ کہتے ہیں میں روایت پر بھروسہ کرتا ہوں کہ بالآخر یہی صحیح ثابت ہوتی ہے، چوں کہ یہی طرز عمل ہے جو ہم اختیار کیے رہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میری اپنی مرحومہ ماں سے کتنی بحثیں ہوتی تھیں۔ میں بڑا پریشان کرنے والا بچہ تھا چوں کہ میں ہمیشہ یہ سوال کرتا تھا کہ یہ کیوں کرتے ہیں وہ کیوں کرتے ہیں اور ان کا جواب ہوتا تھا "نہیں! نہیں ـــ یہ ایسے ہی ہوتا ہے" اور پھر میں کہتا تھا کہ یہ کس نے کہا کہ یہ کام ایسے ہی کرو۔ پھر وہ جواب دیتیں "سبھی کہتے ہیں" اور میرا فوری جواب یہ ہوتا تھا "اچھا تو پھر میں ان کے خلاف ہوں۔ میں اس کام کو اس طرح کروں گا جس طرح میں اسے صحیح سمجھتا ہوں" لیکن مشکل کے دنوں میں روایت اور قومیت کا دباؤ زبردست ہوجاتا ہے۔ ایک بحران پیدا ہوجاتا ہے ایک عدم تحفظ کا احساس ایک دشمن ہمارے

سامنے ہوتا ہے، ایک دشمن ہمارے اندر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔

میکارتھی کے زمانے میں امریکہ میں ایک House Unamerican Activities Committee ہوا کرتی تھی جس کا کام یہ دیکھنا تھا کہ آیا آپ امریکن ہیں یا آپ کمیونزم میں یقین رکھتے ہیں یا اس کے ہمدرد ہیں۔ دوسری بات کا مطلب یہ ہوا کہ آپ غدار ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑسکتا ہے اور گویا آپ ختم ہیں اور قدرتی بحران اور ہنگامی صورت حال کے دنوں میں، جنگ کے زمانے میں تو بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں اور خاص طور پر ایسے میں جب کہ جنگ کی ہڑبونگ زیادہ مچی ہو کہ وہ یہ سوال کریں ''کیا جنگ ہر شخص کے لیے ضروری ہے؟'' ''کیا جنگ کرنا دانش مندی کی علامت ہے؟'' ''کیا بے پناہ بربادی اور خون خرابہ کوئی اچھی چیز ہے؟''

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے دنوں میں میں امریکہ میں مقیم ایک عرب تھا، لیکن میں امریکن بھی تھا، جہاں میں صدام حسین کی کویت پر حملہ کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کی پالیسی کے خلاف تھا اور اس کی مذمت کر رہا تھا وہیں میں نے امریکہ کے قومی سطح کے اس ہذیان کی بھی مذمت کی جسے Operation Desert Storm کا نام دیا گیا تھا کہ ہم وہاں کویت پر حملہ کرنے اور صدام کے کولہوں پر لات مار کر اسے باہر نکالنے جا رہے ہیں اس لیے کہ ہم جارحیت کے خلاف ہیں۔

یہی وہ موقع ہے جہاں دانش ور کو اپنا رول ادا کرنا ہے چاہے یہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ یعنی ایسے موقعے پر جب کہ جنگ کے لیے ہائے ہلڑ مچی ہوئی ہو اور میڈیا یک مشت اس میں ملوث ہو کر ہمیں جنگ کرنی ہے، حق کے لیے جنگ کرنی ہے تو یہی وقت ہے جب ان کو بتایا جائے کہ جناب دنیا میں اور بھی کئی جگہیں ایسی ہیں جہاں تیس سال سے غاصبانہ قبضہ جاری ہے مثلاً فلسطین، شام، لبنان، اردن اور مصری زمینوں پر اسرائیل کا قبضہ۔ کیا امریکہ نے ان زمینوں کو آزاد کرانے کے لیے اسرائیل کے خلاف جنگ چھیڑی۔ بالکل نہیں۔ ترکی نے ۱۹۷۴ء میں قبرص پر قبضہ کرلیا۔ کیا امریکہ نے ترکی کے خلاف جنگ کی؟ بالکل نہیں! انڈونیشیا نے ۱۹۷۶ء میں مشرقی TIMOR پر قبضہ کرلیا اور ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کیا امریکہ نے اس حملے کی مخالفت کی؟ بالکل نہیں! لہٰذا سوال یہ ہے کہ اسی وقت کیوں؟ اس لیے کہ امریکہ کا مفاد تیل کی حفاظت کرنے میں ہے اور یہ پورے قومی مفاد کا معاملہ ہے اس کا تعلق جارحیت مخالف اصول سے نہیں ہے۔ یہ بالکل جدا معاملہ ہے۔

اور اس سلسلے میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آپ محب وطن نہیں ہیں۔ ہم سب کو جھنڈے کو سلامی دینی پڑتی ہے اور میری نظر میں یہ سب سے زیادہ خطرے کی بات ہے۔ جھنڈے کو سلامی دینے کا تصور، نیشنل ایمرجنسی کا تصور، روایت کا رول، پس منظر، اخلاق ان سب کو بنا سوچے سمجھے تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ میری رائے میں دانش ور کا کام یہ ہے کہ وہ ان سب پر سوال اٹھائے اور یہ دیکھے کہ کب یہ تصورات جائز ہیں اور کب نہیں۔

دانش وروں کے سامنے دوسرا بڑا چیلنج وہ ہے جسے ہم پروفیشنل ازم اور مہارت کہتے ہیں۔ ہم میں سے سب ہی لوگ مختلف علوم کا مطالعہ کرتے ہیں، جیسے کیمسٹری، تاریخ، ادب، بائیولوجی وغیرہ وغیرہ، ہم سب کو یونیورسٹیوں سے ان علوم پر عملی کام کی سند دی جاتی ہے، ہم سند یافتہ کیمسٹ یا سند یافتہ استاد کچھ بھی ہوسکتے ہیں اس سے ہمارے دماغ میں کسی خاص شعبۂ علم پر مہارت کا فتور پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے کسی علم کو حاصل کرنے میں بہت سا وقت صرف کیا ہے اور اس سے ہمیں کوئی خاص مرتبہ پانے کا امتیاز حاصل ہوجاتا ہے اور وہ امتیاز بالخصوص ہم اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں مثال کے طور پر B.A یا ph.D وغیرہ اور اسی بنیاد پر ہمیں کوئی روزگار مل جاتا ہے۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ وہ کون سا موقع ہوتا ہے جب آپ اختلاف سے بچنے کے لیے پروفیشنل ازم کی پشت پناہی حاصل کرتے ہیں۔

ویت نام کی جنگ کے زمانے میں جب کہ امریکہ شمالی ویت نام لاؤس اور کمبوڈیا پر ہزاروں ٹن بم گرا رہا تھا، میں نے ایک طالب علم کو اپنے ساتھی (Colleague) سے یہ سوال کرتے سنا ''کیا آپ کسی ایسے عریضے پر دستخط کریں گے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ B-52 بمبار جہازوں سے ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے بے گناہ لوگوں پر بمباری کا اقدام جہاں سے پائلٹ کو نیچے کی حالت کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ کیا گزر رہی ہوگی لیکن جس کے نتیجے میں بچے، عورتیں، غریب لوگ اور کسان ملیامیٹ ہو رہے ہوں، غیر منصفانہ ہے۔ میرے لیے یہ بات باعث شرم تھی اور جس کے بعد میں نے ان کی خبر بھی لی جب میں نے اپنے ساتھی کو یہ کہتے سنا نہیں میں دستخط نہیں کروں گا۔ میں ادب کا پروفیسر ہوں، میں شیکسپیئر اور ملٹن کے بارے میں لکھتا ہوں، میرا بمباری سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میری سمجھ میں ایسی باتیں نہیں''۔ ہم نے کتنی ہی بار یہ سنا ہے'' یہ میرا میدان نہیں ہے، میں اس میں کچھ بھی نہیں کرسکتا''۔

دیکھنا یہ ہے کہ خود آپ کے معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی کی کیا صورت حال ہے۔ دوسرے معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی کی بات کرنا تو آسان ہے، لیکن آپ کے معاشرے میں انسانی حقوق کا پامال ہونا یا ایسے لوگوں کو سزا دیا جانا جن کی رائے آپ کی رائے سے نہیں ملتی۔ آپ اس پر یہ کہہ کر چھوٹ جاتے ہیں ''نہیں نہیں دیکھیے۔ میں تو کیمسٹ ہوں میں شاید اس بارے میں کچھ بھی نہیں کرسکتا''۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ منافقت کو درگزر کرنا ایک ایسی تقلید پسندی کو جنم دیتا ہے جو دانش ورانہ قوت اور دانش ورانہ ایمان داری کی دشمن ہے۔

تیسری بڑی رکاوٹ جو میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے وہ ہے دانش ور کا اقتدار اور طاقت کے ساتھ رشتہ۔ میں اس کے بارے میں بڑی سختی سے سوچتا ہوں۔ میں سیاست میں اپنے لوگوں کے مقاصد کے حصول کے طلب گار کی حیثیت سے داخل ہوا ہوں۔ ان فلسطینی عوام کے لیے جو برسوں سے بولنے کے حق سے محروم ہیں، بے دخل ہیں، جن کی حیثیت تسلیم نہیں کی جارہی ہے اور جو اجتماعی ظلم کا شکار ہیں اور جدوجہد کے مستحق ہیں۔ میرے لیے صرف یہی نہیں ہے کہ میں ایک فلسطینی ہوں بلکہ یہ ہے کہ یہ جدوجہد انصاف کے لیے ہے۔ لیکن ایک سوال یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو موثر بنانے کی کوشش میں آپ کس حد تک جانے کو تیار ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایسے انشا پردازانہ مضامین لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں جنھیں کوئی نہیں پڑھتا اور جن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ہر فرد وبشر بالخصوص دانش ور یا سائنس داں اپنے خیالات کو عملی روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اکثر آپ ایسا اس امر کے بغیر نہیں کرسکتے کہ اس معاملے میں بالآخر سماج میں ایک ایسے آدمی کے نزدیک آنا پڑتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہے، جو آگے بڑھنے میں آپ کی مدد کرتا ہے اور جو اپنے عہد کے اہل اقتدار کا دوست ہے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ اپنے آپ کو موثر بنانے کی جدوجہد میں ہم اقتدار اور طاقت کے ساتھ کہاں تک سمجھوتے کرسکتے ہیں۔ دنیا کے جس حصے سے میرا تعلق ہے یعنی مشرق وسطی وہاں عرب دنیا میں جمہوریت نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ (اور یہ بڑے شرم کی بات ہے) کہ زیادہ تر مطلق العنان حکومتوں کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ لوگ جو حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں یا کرپشن کی بات کرتے ہیں یا براہ راست حکمراں پارٹی کے کرپشن کی بات کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں انھیں اکثر ایذائیں دی جاتی ہیں، جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کا منہ بند کردیا جاتا ہے اور حکمرانوں کو یہ گُر خوب آتا ہے۔

وہ جانتے ہیں کہ اس طرز عمل کے اثر سے ان دانش وروں کے حوصلے پست ہوسکتے ہیں جو بہت سے سوالات اٹھانے کے اہل ہیں۔ چناں چہ اس کا نتیجہ تقلید پسندی اور خود پر روک لگانے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ میں کوئی بات اس لیے نہیں کرنا چاہوں گا کہ اس میں میری ملازمت کو خطرہ ہے، میری ترقی کو خطرہ ہے اور اس میں میرے جیل جانے کا خطرہ ہے۔ امریکہ کئی اعتبار سے نہایت ہی طاقت ور اور متمول ملک ہے۔ وہاں دانش ور طبقے کے بہت سے لوگ خاص طور پر وہ جو سماجی امور سے سروکار رکھتے ہیں خواہ وہ اقتصادیات ہو، سیاسیات ہو یا سماجیات وغیرہ، یہاں تک کہ علم الانسان یا اس سے متعلق شعبے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی میں ان کا سب سے بڑا مقصد طاقت ور کے سامنے ایمان داری کے ساتھ سچ کا اظہار کرنا نہیں ہے بلکہ یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ کس طرح کسی سیاسی پارٹی کے نزدیک آسکتے ہیں۔

اگر ریپبلکن پارٹی کی حکومت ہے تو آپ اپنے آپ کو ریپبلکن طرز فکر میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے اور ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت ہے تو پھر آپ اس کے ہم نوا ہیں اور ایسے میں جائز اور ناجائز اور انسانی اقدار جیسے امور کو نظر انداز کردیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ آپ کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں اور آپ کے آس پاس اس طرح کے لوگ ہیں۔ آپ کے ساتھی جنھیں آپ خوب جانتے ہیں۔ خود میں نے انھیں ویت نام کی جنگ کے دوران، مشرق وسطی کے بحران کے دنوں دیکھا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ ناانصافیاں ہورہی ہیں لیکن وہ کچھ نہیں بولتے اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ انھیں دفاعی شعبے کے لیے کوئی مضمون لکھنے پر مامور کردیا جائے یا انھیں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اپنی مجلس مشاورت میں شامل کرلے اور اگر ان کے نظریات 'خطرناک' ہیں تو انھیں بالکل نہیں پوچھا جائے گا، چناں چہ وہ خاموش رہتے ہیں۔

میری پوزیشن ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں نے کبھی کسی سیاسی عہدے کا خواب نہیں دیکھا کیوں کہ کسی دانش ور کے لیے سیاسی عہدہ اس کی خود مختاری کی موت ہے۔ آپ خود مختار نہیں رہ سکتے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود مختاری اپنے آپ میں کوئی خوبی ہے اس لیے کہ بعض اوقات اس معاملے میں آپ غلط بھی ہوسکتے ہیں۔ آپ کو بڑی حد تک پریس اور میڈیا کی مخلوق بن کر بھی رہنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہاں میڈیا خود مختار ہے۔ میں بھی اپنے ہاں کے میڈیا کے خود مختار ہونے کے بارے میں گھنٹوں بول سکتا ہوں۔ تین چار برس پہلے جب صدر کلنٹن برسر اقتدار آئے تو ان کی حکومت کا ایک بڑا نعرہ یہ تھا کہ ہم ''حفظان صحت کے معاملات کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں''۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ صرف دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ پس ماندہ ملک بھی ہے۔ یہاں یونیورسل ہیلتھ کیئر (Universal Health Care) نام کی کوئی چیز نہیں۔ امریکہ میں پانچ کروڑ سے زیادہ لوگوں کو کوئی صحت بیمہ نہیں ہے۔ امریکہ میں ادویات کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں، پھر سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں، اس سلسلے میں صدر امریکہ نے خود ایک قومی مباحثے کا اعلان کیا۔

(باقی آئندہ)

◆◆◆

اردو دُنیا

پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ منقطع

اردو مدرسین سے دیگر مضامین کی درس وتدریس کا کام لیا جارہا ہے

بلیا، بھیت، اتر پردیش۔ محکمۂ ابتدائی تعلیمات کی اردو دشمنی کے سبب ضلع کے درجنوں پرائمری اسکولوں میں اردو زبان کی درس وتدریس کا انتظام اساتذہ کی کمی کی نذر ہوکر رہ گیا ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے اردو ٹی ای ٹی کے تحت تعینات کیے گئے اردو مدرسین سے دیگر مضامین کی درس و تدریس کا کام لیا جارہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پرائمری اسکولوں میں اردو کی درس و تدریس کا سلسلہ مکمل طور پر منقطع ہوگیا ہے۔ شہر کے محلہ ورکا پرساد واقع شاہ گنج پرائمری اسکول اور اشرف خاں پرائمری اسکول میں اردو داں طبقے سے تعلق رکھنے والے بچوں کی تعداد 80 فیصد سے زائد ہے مگر اسکول میں اردو نہیں پڑھائی جاتی ہے۔ سرکاری اسکولوں میں تعینات اساتذہ کی غفلت اور لاپروائی کے سبب طلبہ و طالبات کو مفت میں فراہم ہونے والی درسی کتب میں اردو زبان کی درسی کتاب نہیں ہے جب کہ بازار میں سرکاری نصاب کی کتب کی فراہمی نہیں ہے۔ ایسے حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سرکاری اسکولوں میں تعینات اساتذہ طلبہ وطالبات کو اردو کی تعلیم دینا بھی چاہیں تو وہ اردو کی درسی کتابیں کہاں سے لائیں؟ بی ایس اے دفتر کے ذرائع سے موصول معلومات کے مطابق دیگر مضامین کے مقابلے اردو کی درسی کتب انتہائی قلیل مقدار میں دستیاب ہوتی ہیں جو کہ مسلم علاقوں کے اسکولوں میں تقسیم کرادی جاتی ہیں۔ امریا بلاک اور للوری کھیڑا بلاک کے درجنوں مسلم مواضعات میں محکمۂ ابتدائی تعلیمات کے جو ادارے ہیں ان میں مسلم طلبہ و طالبات کی تعداد 20 فیصد سے لے کر 90 فیصد تک ہے اس کے باوجود درجنوں اسکولوں میں اردو مدرس کی تعیناتی نہیں کی گئی ہے، جب کہ دسیلپر، بریلی، کھیڑا اکلاں اور بھوجپور کے درجنوں اسکول ایسے ہیں جہاں اردو پڑھنے والا ایک بھی طالب علم موجود نہیں ہے اور وہاں اردو مدرسین کا تقرر کردیا گیا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو عوامی سطح پر سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان

ڈی یو انتظامیہ سے تمام کالجوں میں اردو پڑھانے کا مطالبہ

سمستی پور، بہار (۲۵ اپریل)۔ وزیر اعلیٰ کے ذریعے سبھی پنچایتوں میں اسکول قائم کرنے کے اعلان کے بعد ضلع کلکٹر کے حکم سے محکمۂ تعلیم نے ضلع میں اسکول کھولنے کی کارروائی شروع کردی ہے۔ ضلع کے تمام مڈل اسکولوں سے رپورٹیں مانگی گئی ہیں۔ ضلع میں کل سرکاری مڈل اسکول 131 ہیں، وہیں چار عدد مدرسے جہاں نو تا دسویں تک کی پڑھائی کا نظم ہے اس میں شامل نہیں۔ 34 سنسکرت ہائی اسکول بھی قائم ہیں لیکن تعلیمی محکمہ 131 اسکولوں کی بنیاد پر پنچایتوں میں ایک ہائی اسکول قائم کرنے کا مسودہ تیار کررہا ہے۔ واضح ہو کہ ضلع میں کل 381 پنچایت ہیں جس میں صرف ایک مڈل اسکول کو چھوڑ کر باقی کسی بھی مڈل اسکول کے پاس ضابطے کے مطابق زمین موجود نہیں ہے۔ ضلع تعلیمی محکمہ نے اردو پرائمری اسکولوں کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کرتے ہوئے بہت کم اردو پرائمری اسکولوں کو مڈل اسکول کا درجہ دیا ہے۔ وہیں کئی اردو مڈل اسکول ہائی اسکول بننے لائق ہیں مگر ابھی تک اسے ہائی اسکول کا درجہ نہیں مل سکا ہے۔ اگر ضلع کے اردو مڈل اسکولوں کو ہائی اسکول کا درجہ مل جائے تو ضلع کے دیہی خطے کے اقلیتی بچے و بچیاں جو ہائی اسکول تک نہیں پہنچ پاتے ہیں وہ اپنے حلقے میں قائم اردو ہائی اسکولوں سے میٹرک تک کی تعلیم آسانی سے حاصل کرسکتے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میں دفتری کام کے لیے جلد کسی متبادل کا انتظام کیا جائے گا

نئی دہلی (۲۵ اپریل)۔ جامعہ نگر تھانے میں اردو میں درخواست قبول نہ کیے جانے کے حوالے سے 'انقلاب' میں شائع خبر پر جنوب مشرقی ضلع دہلی کے ایڈیشنل پولیس کمشنر مسٹر اجے چودھری نے بتایا کہ 'انقلاب' نے بہت اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہم اس سلسلے میں کسی متبادل کے لیے سنجیدہ ہیں اور بہت جلد اس پر کام کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں اردو جاننے والوں کی اکثریت ہے، اس لیے تھانے میں ایک نہ ایک اردو داں کا ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ جامعہ نگر تھانے میں گزشتہ دنوں چند لوگوں کو اردو میں درخواست لے جانے کی وجہ سے انھیں واپس کردیا گیا تھا۔ دوسری طرف جامعہ نگر کے لوگوں نے ڈی سی پی کے اس بیان کا خیر مقدم کیا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جامعہ نگر تھانہ ایسی جگہ ہے جسے اردو کا گہوارہ کہا جاتا ہے اس لیے یہاں دفتری کام کاج کے لیے اردو داں کا ہونا ضروری ہے۔ لوگوں نے امید ظاہر کی ہے کہ یہ کام جلدی ہوجائے گا۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو کی تدریس کو درجہ آٹھ تک لازمی کرنے کا مطالبہ

فیض آباد، یوپی (۲۳ اپریل)۔ اردو بچاؤ تحریک نے میٹنگ کرکے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ صحیح طریقے سے سہ لسانی فارمولے کو نافذ کیا جائے اور اردو کی تعلیم کو پرائمری سے درجہ آٹھ تک لازمی قرار دیتے ہوئے سبھی تعلیمی اداروں میں اس کی تدریس کو ضروری کیا جائے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد حلیم نے کہا کہ اردو کے ساتھ گزشتہ ساٹھ سال سے ناانصافی ہورہی ہے، اب اردو کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ قومی اتحاد کی مضبوطی کے لیے اردو سے بہتر کچھ بھی نہیں ہے اس لیے سب بچوں کو پرائمری سے آٹھویں تک تین زبانیں لازمی طور سے پڑھائی جانی چاہیے (۱) سرکاری زبان ہندی (۲) عالمی زبان انگریزی اور تیسری زبان علاقائی پڑھائی جانی چاہیے جو شمالی ہند میں اردو کے نام سے جانی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا بہت ہی کم اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے جس سے اردو کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اگر اردو کو لازمی قرار دے دیا جائے تو اردو زبان کی انقلابی ترقی ممکن ہے اس لیے حکومت کو اس پر دھیان دینا چاہیے۔ (آگ، لکھنؤ)

نیٹ امتحان اردو میں بھی لیا جائے

سپریم کورٹ کی ہدایت

نئی دہلی (۹ مئی)۔ میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لیے داخلہ امتحان نیشنل ایلی جیبلیٹی انٹرنس ٹسٹ (این ای ای ٹی/ نیٹ) سے اردو زبان کو خارج کرنے کے معاملے میں عدالت عظمیٰ نے راحت افزا فیصلہ سنایا ہے۔ عدالت کے اس فیصلے سے مہاراشٹر کے امیدواروں کو عارضی راحت ملی ہے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس التمش کبیر کی سربراہی والی سہ رکنی بنچ نے حکومت ہند کے خلاف فاطمہ انصاری و دیگر کی جانب سے درج مقدمے کی سماعت کے بعد معاملے کو رفع دفع کرتے ہوئے سی بی ایس ای کو یہ ہدایت جاری کی ہے کہ وہ آٹھ ہفتے کے اندر نیٹ ۲۰۱۳ کے لیے صرف مہاراشٹر کے اردو میڈیم کے امیدواروں کو ضمنی طور پر شامل امتحان کرے۔ سپریم کورٹ کی اس ہدایت کے بعد مہاراشٹر میں اردو میڈیم کے میڈیکل سائنس کے دو ہزار سے زیادہ امیدواروں کو راحت مل گئی ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کی جانب سے معاملے کی پیروی کررہے ایڈوکیٹ شکیل احمد سید نے 'انقلاب' کو بتایا کہ آج سپریم کورٹ نے مہاراشٹر کے طلبہ کے لیے آٹھ ہفتوں کے اندر نیٹ ۲۰۱۳ کا ضمنی ٹسٹ اردو زبان میں کرانے کی ہدایت دی ہے۔ انھوں نے سماعت کے دوران عدالت کے ذریعے دی گئی ہدایت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ہدایت صرف امسال ہونے والے ٹسٹ کے لیے مخصوص ہے۔ ساتھ ہی اس سے ان طلبہ کو کوئی راحت نہیں ملے گی جو فارم بھرنے کے وقت دوسری زبان کو اختیار کرچکے ہیں، انھیں اختیار کردہ زبان میں ہی ٹسٹ دینا ہوگا۔ (انقلاب۔ دہلی)

نند کشور وکرم کو قطر کا 'عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ'

نئی دہلی (۱۹ اپریل)۔ قطر کا 'عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ' برائے ۲۰۱۳ اس سال اردو کے معروف ادیب نند کشور وکرم کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں 'مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ' دینے کا فیصلہ آج نئی دہلی میں جیوری کی ایک میٹنگ میں کیا گیا۔

اس ایوارڈ کے تحت ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ دیا جائے گا۔ جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ نند کشور وکرم اردو کے ان بے لوث اور بے نیاز خدمت گاروں میں سے ہیں جو پچھلی نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے اردو نثری ادب، اردو فکشن اور اردو کی ادبی صحافت کی بے مثال خدمت کررہے ہیں۔ نند کشور وکرم کے ناول 'انیسواں ادھیائے' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ برصغیر کے تہذیبی اور سماجی دو طرفہ رشتوں پر مبنی یہ ناول نہایت مقبول ہوا اور پاکستان میں بھی شائع کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا ۲۰۱۳ کا ایوارڈ فکشن میں نند کشور وکرم کی مجموعی تخلیقی خدمات کے لیے دیا جارہا ہے۔ دوحہ قطر جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں جیوری کا اجلاس انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں منعقد کیا گیا جس میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر شافع قدوائی اور مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے چیئرمین محمد عتیق بھی موجود تھے۔

قابل ذکر ہے کہ نند کشور وکرم کے 'آوارہ گرد'، 'آدھا پل' اور دیگر افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ علاوہ ازیں نند کشور وکرم ہندی، اردو اور پنجابی زبانوں کے ادب کو اپنے تراجم کے ذریعے ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کی کل تصانیف کی تعداد تقریباً 50 سے بھی زائد ہے۔ اردو میں ان کی ایک درجن سے زائد اور ہندی میں نصف درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ وہ اردو کے مشہور ادبی رسالہ 'آجکل' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور روزنامہ 'قومی آواز' اور 'امرت' کے ساتھ ماہنامہ 'ارتقا' سے بھی وابستہ رہے۔

عالمی فروغ اردو ادب کے کوآرڈینیٹر کفایت دہلوی کی اطلاع کے مطابق انھیں یہ ایوارڈ اکتوبر میں دوحہ قطر میں منعقد ایک پر وقار تقریب میں دیا جائے گا۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو کے فروغ کے تئیں سرکار سنجیدہ نہیں

اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے ٹھوس اقدام کیے جائیں: محمد ادیب

نئی دہلی (۲۶ اپریل)۔ راجیہ سبھا کے ممبر محمد ادیب نے کہا ہے کہ اردو کے فروغ کے تئیں سرکار سنجیدہ نہیں ہے اور اس زبان کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے سرکار سے مطالبہ کیا کہ وہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے ٹھوس اقدام کریں۔ ممبر پارلیمنٹ نے مزید کہا کہ دہلی میں اردو زبان کی تعلیم کا انتظام درست نہیں ہے اور اس سے اردو پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ وہ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ایم پلّم راجو کے راجیہ سبھا میں دیے گئے جواب پر عدم اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک میں غیر ملکی زبانوں جرمنی، فرانسیسی، جاپانی وغیرہ کی تعلیم کے لیے اچھے انتظامات ہیں لیکن ملک کو انقلاب زندہ باد جیسے نعرے دینے والی اس شیریں زبان کی تعلیم کے لیے انتظامات ناکافی ہیں۔

خیال رہے کہ گزشتہ روز محمد ادیب کے ایک سوال کے جواب میں مرکزی وزیر ایم پلّم راجو نے بتایا تھا کہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے قومی کمیشن برائے اقلیتی ادارے یا این سی پی یو ایل سے کوئی رپورٹ یا تجاویز نہیں ملی ہیں۔ وزیر موصوف نے بتایا تھا کہ اردو کے فروغ کے لیے ۱۹۹۶ء میں این سی پی یو ایل قائم کی گئی تھی اور اس کی گرانٹ میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ۲۰۱۲-۱۳ء میں اس ادارے کو چار ہزار لاکھ روپے دیے گئے تھے جب کہ رواں سال میں اس کا بجٹ بڑھا کر چھ ہزار لاکھ کر دیا گیا ہے۔ محمد ادیب نے خصوصی بات چیت میں سرکار کے اقدام کو ناکافی بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اردو پڑھانے کے لیے ہر اسکول میں ٹیچر مقرر کیے جائیں اور اسکول انتظامیہ یا سرکاری محکمے اس بات کا انتظار نہ کریں کہ جب اردو پڑھنے والے آئیں گے تو ان کے لیے اردو ٹیچر کا انتظام کر دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر سرکار واقعی اردو کے تئیں سنجیدہ ہے تو وہ پہلے اسکولوں میں ٹیچر مقرر کرے۔ دہلی سرکار کی یہ پالیسی بھی درست نہیں ہے کہ پہلے اردو پڑھنے والے طلبہ جمع کیے جائیں اس کے بعد اردو ٹیچر مقرر کیے جائیں گے۔

ممبر راجیہ سبھا نے کہا کہ جب ٹیچر موجود ہوں گے تو پڑھنے والے خود بخود آ جائیں گے۔ انھوں نے مرکزی سرکار سے مطالبہ کیا کہ وہ سینٹرل اسکولوں، سروودیہ اور نوودیہ ودیالیوں میں اردو ٹیچر بحال کرے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے اردو والوں کو روزگار بھی ملے گا اور پڑھنے والوں کی تعداد بھی بڑھے گی۔ وزیر موصوف نے بتایا تھا کہ اس وقت ملک کی تقریباً 52 یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے ہیں اور مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں اردو میڈیم کے ذریعے اعلا تعلیم دی جاتی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو اسکولوں کے ساتھ محکمہ تعلیم کا سوتیلا رویّہ

سستی پور، بہار (۲۵ اپریل)۔ وزیر اعلا کے ذریعے بھی پنچایتوں میں اسکول قائم کرنے کے اعلان کے بعد ضلع کلکٹر کے حکم سے محکمہ تعلیم نے ضلع میں اسکول کھولنے کی کارروائی شروع کر دی ہے۔ ضلع کے تمام مڈل اسکولوں سے رپورٹیں مانگی گئی ہیں۔ ضلع میں کل سرکاری مڈل اسکول 131 ہیں، وہیں چار صد مدرسے جہاں فوقانیہ تک کی پڑھائی کا نظم ہے اس میں شامل نہیں۔ 34 سنسکرت ہائی اسکول بھی قائم ہیں لیکن تعلیمی محکمہ 131 اسکولوں کی بنیاد پر پنچایتوں میں ایک ہائی اسکول قائم کرنے کا مسودہ تیار کر رہا ہے۔ واضح ہو کہ ضلع میں کل 381 پنچایت ہیں جس میں صرف ایک مڈل اسکول کو چھوڑ کر باقی کسی بھی مڈل اسکول کے پاس ضابطے کے مطابق زمین موجود نہیں ہے۔ ضلع تعلیمی محکمہ نے اردو پرائمری اسکولوں کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کرتے ہوئے بہت کم اردو پرائمری اسکولوں کو مڈل اسکول کا درجہ دیا ہے۔ وہیں کئی اردو مڈل اسکول ہائی اسکول بننے لائق ہیں مگر ابھی تک اسے ہائی اسکول کا درجہ نہیں مل سکا ہے۔ اگر ضلع کے اردو مڈل اسکولوں کو ہائی اسکول کا درجہ مل جائے تو ضلع کے دیہی علاقے کے اقلیتی بچے و بچیاں جو ہائی اسکول تک نہیں پہنچ پاتے ہیں وہ اپنے حلقے میں قائم اردو ہائی اسکولوں سے میٹرک تک کی تعلیم آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو زبان کے ساتھ انصاف کا مطالبہ

نئی دہلی (۴ مئی)۔ جدی ماڈرن سینئر سیکنڈری اسکول میں آل انڈیا مسلم ایکتا کمیٹی کے زیر اہتمام ایک میٹنگ ہوئی جس میں محبان اردو نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے تبادلۂ خیال کر کے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو کو دیگر زبانوں کی طرح روزگار سے جوڑا جائے تاکہ اردو تعلیم یافتہ طبقے کی بھی معاشی حالت بہتر ہو سکے۔ اس موقع پر مہمان خصوصی حاجی اکرام حسن نے کہا کہ کانگریس حکومت نے دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا جسے طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک کوئی ایسا اقدام نہیں کیا ہے، جس سے اردو تعلیم یافتہ روزگار سے جڑ جائیں۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس حکومت اور اس کے وزیر تعلیم نے کئی مرتبہ ٹیلی ویژن، اخبارات اور عوامی جلسوں میں اعلان کیا ہے کہ جن اسکولوں میں دس مسلم بچے بھی ہوں گے وہاں اردو ٹیچر کی تقرری کی جائے گی لیکن عملی طور پر کچھ نہ ہونے سے اردو تعلیم یافتہ طبقہ مایوسی کا شکار ہے۔ حاجی اکرام نے کہا کہ اگر حکومت اردو زبان کے ساتھ انصاف کرے تو پورے ملک میں لاکھوں اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار سے جڑنے کا موقع فراہم ہونے سے ان کی معاشی حالت ٹھیک ہوگی۔ حاجی اکرام حسن نے کہا کہ مسلم عوامی نمائندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر آ کر جد وجہد کریں تاکہ اردو کو اس کا جائز حق مل سکے۔ نیو جعفر آباد ڈی ڈی اے آر ڈبلیو اے کے صدر جلال فاروقی، سماجی کارکن جاوید خاں اور افضل صدیقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ بعد ازاں متفقہ طور پر اردو کے حقوق کی حصولیابی کے لیے ایک میمورنڈم تشکیل دیا گیا جو حکومت کو بھیجا جائے گا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

بالی میونسپلٹی کے علاقوں میں اردو کے نفاذ کے لیے

حکومت کے نوٹیفکیشن پر عمل کیا جائے

ہوڑہ، مغربی بنگال (۲۱ اپریل)۔ مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے بعد ممتا حکومت نے متعلقہ اضلاع، بلدیاتی اداروں اور بلاک سطح پر نوٹیفکیشن جاری کر کے نئے قانون پر فوری عمل آوری کے لیے کہا ہے۔ ہوڑہ ضلع میں بالی میونسپلٹی بھی ان بلدیاتی اداروں میں شامل ہے جہاں اردو کا دوسری سرکاری زبان کے طور پر نفاذ ہونا ہے۔ حکومت کی جانب سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے سے متعلق حکومت مغربی بنگال کے نوٹیفکیشن نمبر 4298/ICA/121/(XIII)08/2012 تاریخ ۲۶ مارچ ۲۰۱۳ کے ذریعے بالی میونسپلٹی کے چیئرمین کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ مذکورہ نوٹیفکیشن کی روشنی میں بالی میونسپلٹی کے اپوزیشن رہنما اور وارڈ ۱۸ کے کونسلر ریاض احمد نے ایک عرض داشت لکھ کر مذکورہ نوٹیفکیشن کے مطابق عمل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ریاض احمد نے چیئرمین سے گزارش کی ہے کہ میونسپلٹی کے بورڈ آف کونسلرس کی میٹنگ میں مذکورہ نوٹیفکیشن کو منظوری دینے اور اس پر عمل آوری کو یقینی بنایا جائے۔ انھوں نے چیئرمین ارون لہری سے میونسپلٹی اور دیگر محکموں کے ناموں کی تختیاں اردو میں بھی لگانے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ممتا حکومت نے اردو والوں کے دیرینہ مطالبے کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ ہوڑہ کی بالی میونسپلٹی میں بھی اب قانونی طور پر نفاذ اردو کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ حکومت مغربی بنگال کے ڈپٹی سکریٹری اے ایچ مجمدار نے نوٹیفکیشن جاری کر کے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی ہدایت دی ہے۔

اب اردو والوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ارباب میونسپلٹی کو قانون پر عمل آوری کے لیے مجبور کریں۔ انھوں نے درخواستیں اردو میں تحریر کرنے کی اپیل کی، ساتھ ہی میونسپلٹی میں اردو جاننے والے ملازموں کے تقرر کا بھی مطالبہ کیا۔

(اخبار مشرق، کلکتہ)

اردو اسکولوں سے متعلق ریاستی حکومت کے رویے پر ناراضگی

حیدرآباد (۳ اپریل)۔ وزیر ثانوی تعلیم کی جانب سے طلب کردہ ورکشاپ میں اردو اسکولوں سے متعلق ریاستی حکومت کے رویے پر اردو ٹیچرس کے نمائندوں نے شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ریمارک کیا کہ ریاست میں اردو اسکولس یتیم ہیں، ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اردو ٹیچرس کے نمائندہ سید ہدایت اللہ نے کہا کہ مسلسل مطالبات کے باوجود حکومت اردو ٹیچرس کے تقررات نہیں کر رہی ہے۔ جس کی وجہ سے آندھرا پردیش میں 50 فیصد اردو میڈیم اسکولس بند ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اسکولوں میں ودیا والینٹرس بھی نہیں ہیں، دو سال پہلے طلب کردہ اجلاس میں وزیر موصوف کو ان تمام مسائل سے واقف کروایا گیا تھا لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی مسائل جوں کا توں ہیں۔ سید ہدایت اللہ نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں قانون حق لازمی تعلیم پر عمل آوری نہیں کی جا رہی ہے۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جی او نمبر 472 پر عمل آوری کو یقینی بنائے۔ ریاست میں کئی ایسے اسکول ہیں جہاں ہر کلاس میں 20 تا 30 طلبہ ہیں لیکن ان اسکولوں میں ٹیچرس کے نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم پر اثر پڑ رہا ہے۔ انھوں نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اقلیتوں کی ترقی کے اقدامات کا دعوا کرتی ہے لیکن اردو میڈیم اسکولوں میں بچوں کو نصابی کتب فراہم نہیں کی جا رہی ہیں، یونیفارم نہیں ہیں اور نہ ہی مڈ ڈے میل فراہم کیا جا رہا ہے۔ سید ہدایت اللہ نے وزیر ثانوی تعلیم کو بتایا کہ راجیو ودیا مشن میں ماینارٹی کوآرڈینیٹر کی پوسٹ بھی ایک سال سے خالی ہے، جس کا سخت نوٹ لیتے ہوئے متعلقہ عہدیداروں سے ڈاکٹر ایس شیلجا ناتھ نے جواز طلب کیا۔ ان کے علاوہ دوسرے نمائندوں نے بھی وزیر موصوف کو بتایا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کا ڈراپ آؤٹ بہت زیادہ ہو گیا ہے اور بچے مزدوری کر رہے ہیں۔ کڑپہ کی مثال پیش کرتے ہوئے سید ہدایت اللہ نے بتایا کہ کڑپہ کے 53 منڈل میں صرف 27 ہائی اسکول ہیں جب کہ ہر منڈل میں ایک اسکول کی ضرورت ہے۔ وزیر ثانوی تعلیم نے متعلقہ عہدیداروں کو ہدایت دی کہ وہ اردو میڈیم اسکولوں کے سلسلے میں تمام معلومات انھیں فراہم کرائیں۔

(سیاست، حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر مضامین
مصنف : ڈاکٹر ودیا ساگر آنند
مرتب : پریم گوپال متل
ضخامت : ۲۰۸ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی-۲
تبصرہ نگار : ظفر مرادآبادی

اردو کے بزرگ قلم کاروں میں جنھیں بلاشبہ یونیورسل ہونے کا امتیاز حاصل ہے اُن میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند بھی ہیں جن کے لیے تمام اردو دنیا صرف ان کی اپنی دنیا ہے اور اردو نثر و نظم کا ہر میدان ان کا اپنا ہے، جدوجہد آزادی کا ہر کردار خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان کا اپنا ہے اور وہ ہر مجاہد آزادی کو صرف اپنا ہی سمجھتے ہیں اس کے لیے ان کا قلم ہر وقت رواں اور دل ہر وقت خراج تحسین، عقیدت سے لبریز رہتا ہے۔

ڈاکٹر ودیا ساگر کا ادبی منظر نامہ ایک ایسی کہکشاں ہے جس میں نظم و نثر کی شکل میں بے شمار ستارے جگمگا رہے ہیں۔ ہر چند بنیادی طور پر آپ آنند کا ساگر یعنی شاعر ہیں لیکن آپ کے نثری مضامین بھی اہل ادب اور اہل نظر میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ 'مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر مضامین' ڈاکٹر ودیا ساگر کے مرکزی خیال اور بنیادی نقطۂ نظر کے عکاس نثری مضامین کی ایسی دستاویز ہے جس میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی ہر مذہب اور مسلک کے کرداروں کا بلاتفریق ذکر خیر موجود ہے۔ مذکورہ کتاب میں تیرہ مضامین اور ایک انٹرویو شامل ہے جو ہندوستان کے پچیسویں جشن جمہوریت کے موقعے پر ڈاکٹر اندرجیت پال نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے لیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ راجہ رام موہن رائے، نور عنایت خاں، ونایک دامودر ساورکر، بابا صاحب امبیڈکر، گورکھ سنگھ مسافر، نرتیہ ناٹک کی بانی مینکا، جدید چمن کے معمار ڈاکٹر من موہن سین، کتنا بدنصیب ظفر، دورِ حاضر میں رامائن کی معنویت، برطانیہ میں ہندوستانی غلامی سے آزادی کی طرف اور میرا سفر، ڈاکٹر ساگر کے ایسے مضامین ہیں جن میں تاریخی حقائق کے علاوہ سیاسی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا میں جدوجہد آزادی کے قابل ذکر کرداروں پر بے لاگ اظہار خیال موضوعات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ ان مضامین میں مذاہب اور ممالک کی کوئی حد بندی نہیں ہے جس کے سبب ڈاکٹر ساگر کے مزاج، رجحان اور انسان دوستی کا اظہار ملتا ہے، اردو زبان میں ایسے قلم کار بہت کم ہیں جنھوں نے انسانیت کو ہر اعتبار سے سربلند کیا ہو۔

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند بنیادی طور پر شاعر ہیں اور ایسے شاعر جن کا دل محبت اور اخوت سے سرشار ہے۔ پریم گوپال متل نے اپنے مقدمے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"آنند صاحب کی یہ تحریریں موصوف کی ہمہ جہت علمی، ادبی، سیاسی و مذہبی وابستگیوں اور دلچسپیوں کا ایسا مکمل منظر نامہ ہیں جن کے مطالعے سے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے وسیع اور گہرے مشاہدے اور تدبر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے"۔

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر آنند کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی اہل دل اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔

نام کتاب : آٹھواں آسمان (شعری مجموعہ)
مصنف : محمد علی اثر
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۳۰۴ صفحات
قیمت : ۲۲۵ روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸، وکیل اسٹریٹ کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی-۱۱۰۰۰۶
مبصر : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

'آٹھواں آسمان' مشہور شاعر، محقق اور نقاد پروفیسر محمد علی اثر کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے سات مجموعے 'ملاقات' (۱۹۸۰ء)، 'حرف نم دیدہ' (۱۹۹۰ء)، 'نعت رسولؐ خدا' (۲۰۰۰ء)، 'انوار تجلی روشن' (۲۰۰۳ء)، 'خرابے میں روشنی' (۲۰۰۷ء)، 'اللہ جل جلالہ' (۲۰۰۷ء) اور 'قلم کی سجدہ ریزیاں' (۲۰۱۰ء) منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ اثر کے قلم کی روانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان مجموعوں کے علاوہ ان کی پچیس سے زائد نثری کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں جن کے سبب ان کو تحقیق و تنقید کے میدان میں استناد حاصل ہے۔ موصوف بہت عرصے سے انتہائی خطرناک عارضے کی وجہ سے زندگی کی ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جہاں بے بسی اور بے دست و پائی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تاہم ان کی ہمت اور حوصلے کو دیکھتے ہی بنتا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے اس ناگہاں و ناچار سفر کی گونج اکثر ملتی ہے مگر ان کو خدا اور رسول کی برکتوں پر پورا بھروسہ ہے کہ وہی ان مشکلوں سے نجات دلا سکتے ہیں:

بے چین ہوں آفاق کی وسعت میں بکھرنے
کیوں جسم کے زندان سے رہائی نہیں ملتی
جب سے ڈالا گیا تنہائی کے محبس میں مجھے
ساز دل ہونے لگا صوت و صدا سے خالی
کب تک یونہی معذور رہوں گا، اللہ
اس حال میں مر جاؤں گا میں کیا، اللہ
کب تک رہوں اپنوں پہ مصیبت بن کر
منہ دیکھے گی کب شب یہ سحر کا، اللہ
(رباعی)

زیر نظر مجموعے میں جہاں ایک جانب روایتی اصناف سخن جیسے حمد، نعت، غزل، نظم، رباعی اور قطعہ شامل ہیں، وہیں دوسری جانب جدید اصناف جیسے ہائیکو، علائی، اور ماہیا بھی ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کلاسیکی اور جدید شاعری کا خوش نما سنگم ہے۔ وہ استعارات اور تلمیحات کا بڑی خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں اور ہندی کے ملائم الفاظ سے بھی استفادہ کرتے ہیں مثلاً دھڑکن، سرن، منمن، لگن، چتون وغیرہ۔ حمدیہ و نعتیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک قطرے کا بھی تھا آرزو
اور دریا بہا دیا تو نے

سرتاپا گناہ گار ہوں تو بخش دے مولا
سر بھی ترا سجدے میں ہے اور آنکھ بھی نم ہے

اثر کی غزلیں ان کے دل کی آواز ہیں۔ ان کی شکستگی، معذوریاں اور ناچاریاں ان کے کلام کو پرسوز اور تصور غم بناتی ہیں مگر ذاتی زندگی میں اتنی صعوبتیں اٹھا کر بھی کہیں پر تلخی اور بے زاری نہیں ملتی بلکہ غزلوں میں بھی وہ حمد و ثنا کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لے سے زیادہ مقصد کو ترجیح دیتے ہیں اور سادہ، آسان اور عام فہم الفاظ سے دل کو چھو لینے والی تصویریں کھینچتے ہیں:

بھیگا بھیگا اس کا آنچل
دل میں اثر کے آگ لگائے

جا رہا تھا میری باتوں سے خفا ہو کر مگر
جاتے جاتے اس کا مڑ کر دیکھنا اچھا لگا

ان کی غزلوں میں حسن و عشق کی رمزیات، زندگی کا سوز و گداز اور عشق الٰہی کا رجحان ملتا ہے۔ چند منتخب اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

عزم و استقلال:
الجھیں پاؤں کی زنجیر تو بجتی ہیں مگر
ہم کہاں راہ میں رکنے پہ یقیں رکھتے ہیں

عشق الٰہی:
جس نے جھکا دیا ترے آگے سر نیاز
پھر اس کے بعد وہ اس کا کہیں سر جھکا نہیں

عشق:
اندھیری راتوں میں اکثر ہم اپنی پلکوں پر
تمھاری یاد کے جگنو سجائے رکھتے ہیں
جس شخص کو بھولے ہوئے گزرا ہے زمانہ
کل رات اسی شخص کی یاد آئی بہت ہے

مامتا:
ٹل جاتی ہے ہر آفت اس کی ہی دعاؤں سے
کیا ماں کی محبت ہے بیٹا ہی سمجھتا ہے

خود آگہی:
ہوا اپنے خول میں جب بند تھا تو کچھ بھی نہ تھا
نکل کے آیا جو باہر تو آسمان ہوا
مرا ضمیر کہاں کھو گیا میرے اندر
تمام عمر جو لڑتا رہا میرے اندر

حق گوئی:
اثر ہمیشہ طرفدار حق ہوئے ہم لوگ
کہ جب بھی کذب و صداقت کا امتحان ہوا
دیکھ کر شکل و شباہت خوش گمانی ٹھیک ہے
جو بڑا جاہل ہے اس کی مدح خوانی ٹھیک ہے

فلسفۂ زندگی:
زندگانی ترا عقدہ یہ کھلا پانی پر
بلبلا بنتے ہی جو ٹوٹ گیا پانی پر

رجائیت:
نقش باطل کے سبھی مٹ جائیں گے
اور ابھریں گے صداقت کے نشاں
یہ جہاں اہل خرد سے نہیں ہوگا خالی
دیر دو اور بھی آئیں گے یہاں دوسرے لوگ

پروفیسر محمد علی اثر کی شاعری میں سماجی و سیاسی شعور کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ دہشت گردی، فرقہ واریت، انارکی اور سیاسی کارستانیوں پر انھوں نے فکر انگیز شعر کہے ہیں:

لہو ہی لہو ہے جدھر دیکھیے
جہاں میں فقط کربلا رہ گیا
اشجار جو پھلوں سے لدے تھے اکھڑ گئے
وحشی ہوا کے زور سے کچھ بھی بچا نہیں
کہاں لے آئے ہو مجھ کو رفیقو
مرے گھر کا تو یہ نقشہ نہیں تھا
ہر ایک سمت سے پتھر برس رہے ہیں اثر
ہم اپنے شہر میں ٹوٹے ہیں آئینوں کی طرح
جو شیطان کر نہیں سکتا، وہ لیڈر کر دکھاتا ہے
کہ اس کا کام ہی آبادیاں ویران کرتا ہے

محمد علی اثر کی نظموں میں بھی فکر و خیال کی رعنائی اور روشن خیالی ملتی ہے۔ ماں کا سایہ رحمت اٹھ جانے پر، شناخت، زوال، وکٹیم، مادر مہربان اور مرے خدا بہت ہی موثر نظمیں ہیں۔ انھوں نے سقوط تبسم، ڈاکٹر زور اور شاذ تمکنت کی یاد میں بھی چند نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ رباعی، قطعہ، علائی، ہائیکو اور ماہیا میں بھی پروفیسر اثر نے اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

تمام عمر رہے دل میں درد کے سائے
غم حیات کا یہ ساتھ چھوٹتا ہی نہیں
یہ کیسی رات ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی
مری نظر کو اجالوں سے واسطہ ہی نہیں
(قطعہ)

تیرا جلوہ ہے چار سو سائیں
پھول میں چاند میں شفق میں تو
ذرّے ذرّے میں تو ہی تو سائیں
(علائی)

بیت جھڑ کا موسم
خاک اڑائے گا کب تک
آنکھ بھری ہے غم
آنکھوں میں آنسو
ڈھونڈ رہا ہوں اس کو میں
وہ جو ہے ہر سو
(ہائیکو)

ساقی ہوں میں منزل تو
حمد کروں تیری
تعریف کے قابل تو
یادوں کے جھلے سے
چاند نکل آیا
بادل کے دریچے سے
(ماہیا)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پروفیسر محمد علی اثر کی شاعری ذاتی کرب، عشق حقیقی اور عصری حسیات کی آئینہ دار ہے جو غم دوراں میں مدغم ہو کر آفاقیت حاصل کرتی ہے۔

•••

بقیہ: ایک انوکھی فن کارہ لیلا نائیڈو

تھی جو اپنے دور کی ہالی وڈ کی عالمگیر شہرت رکھنے والی ایکٹرس تھیں۔ اس نے ہالی وڈ کی ایک فلم 'ٹرنیگز' میں پارٹ ادا کیا۔ یہ پہلی بڑی انگریزی فلم تھی جس میں کسی ہندستانی اداکارہ کو اہم رول دیا گیا تھا۔ اس میں لیلا نے مشہور اداکار CRAIG STEVEN کے بالمقابل کام کیا۔ لیلا تین بین الاقوامی زبانیں انگلش، فرنچ اور جرمن بخوبی جانتی تھی اس لیے یورپ کے ہر ملک میں اور امریکہ میں ہر جگہ اس کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ اسے یورپین ہسٹری پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جرمن قوم احساسِ کمتری میں مبتلا تھی جس کی وجہ سے اس نے دنیا کو دو بھیانک عالمگیر جنگوں کی آگ میں جھونک دیا تھا اور ہر طرف تباہی پھیلا دی تھی۔

۱۹۵۸ء میں جب لیلا اپنے والدین کے ساتھ دِلّی واپس آئی تو وہاں آل انڈیا حسن کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ لیلا نے بھی اس میں شمولیت کی اور خوش قسمتی سے مس انڈیا منتخب کر لی گئی حالاں کہ اسے کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس فیصلے سے وہ حیران تھی کیوں کہ اس نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مس انڈیا بن جائے گی۔ اگلے روز جب راجد حانی کے سبھی اخبارات نے اس کی تصاویر شائع کیں تو میں دِلّی میں ہی تھا۔ تصویریں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ واقعی اس حسینہ میں مقناطیسی کشش ہے اور وہ گلزارِ حسن کی ایک کھِلتی ہوئی کلی اور مہکتا ہوا گلاب ہے۔

حسنِ قدرت کی وہ گراں قدر اور عمر اثر ذہن ہے جس کی قیمت قارون کے خزانے سے بھی نہیں چکائی جا سکتی اور ایسی بیش بہا ذہن کی حامل شخصیت میں ایک خاص قسم کا وقار، ایک خیرہ کن تجلّی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کی نظریں ایسی پُرنور ہستی کے آگے احتراماً جھک جاتی ہیں۔ لیلا نائیڈو حسنِ قدرت کا شاہکار تھی۔ اس کے جمالِ عالم افروز کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ میں نے اس کا قلمی خاکہ یوں تیار کیا:

"لیلا نائیڈو کو دیکھ کر پاک اور مقدس یونانی دیویوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اسے سامنے پا کر ذہن میں شعروں کی رنگینی اور دل میں سازوں کا گداز جاگ اٹھتا ہے۔ اس کا اچھوتا حسن پہلی ہی نظر میں انسان کے دل میں پاکیزہ محبت پیدا کر دیتا ہے اور اس کے تئیں عزت اور عقیدت کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ اہلِ بصیرت کو اس کے شگفتہ اور شاداب چہرے میں نورِ الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ اس کے روبرو سجدہ کرنا باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ یہی اس کے حسن کی عظیم ترین فتح ہے۔

چاند سے زیادہ حسین، قوسِ قزح سے زیادہ رنگین، چاندنی سے زیادہ شفاف، کلی سے زیادہ نازک، شبنم سے زیادہ فسوں ساز، وہ گل سے زیادہ دل آویز، نسیمِ سحر سے زیادہ روح افزا، کوئل کی کوک سے زیادہ نغمہ نواز، عالم نور و ناز کی یہ نازنین اہلِ دل کے لیے بادۂ شیراز اور حسن پرستوں کے لیے قلوپطرۂ ثانی ہے۔ کاشانۂ حسن کی نیرنگیاں اسی شمعِ حسن کے دم سے ہیں اور عالمِ شباب پر اسی کی حکمرانی ہے۔ حالات کے سرچشمے اور محبت کے جھرنے اسی دیباچۂ کائنات سے پھوٹتے ہیں۔ اس کا حسن و شباب مہرِ عالم تاب بن گیا ہے۔ کیا قد و قامت اور کیا خد و خال سب میں بے نظیر ہے۔ وہ بولتی ہے تو بہار کی راگنی بھی رشک کرتی ہے۔ وہ جس طرف نظر اٹھاتی ہے کہکشاں بچھ جاتی ہے، جس طرف رخ کرتی ہے قوسِ قزح بن جاتی ہے۔ جس جا جاتی ہے وہ جگہ بقعۂ نور نظر آتی ہے۔ اس سنبلِ معطر، نگاہِ برق پاش، موسیقیِ خراماں، آئینۂ الفت، شانِ بے خبری، قیامتِ مجسم اور پیکرِ شعریت کو دیکھ کر نسلِ آدم تو کجا ملائک بھی سجدہ کرتے ہیں۔

فطرت نے اس کے نرم و نازک جسم میں نقش و نگار کچھ اس طرح ابھارے ہیں کہ اسے دیکھ کر دنیا طلسمِ کیف ہیولوں میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا بھرپور حسن و شباب آسمان پر زہرہ، مشتری اور ثریا کو بھی رشک کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی شخصیت میں کسی مصور کا دل، کسی مغنی کی لَے اور کسی شاعر کی منزل نہاں نظر آتی ہے۔ وہ جنتِ کہکشاں ہے جو گردوں سے اتر کر آئی ہے۔ اس نے اپنی خوب صورتی کے جلوے بکھیر کر کائنات میں رنگینی اور وارفتگانِ محبت میں مستی پیدا کر دی ہے۔ اس کا شگفتہ شباب بدرِ کامل کی چکوری اور باغِ بہشت کی بہار سے بھی زیادہ خوشنما ہے۔ اس کے لاثانی رنگ و روپ کو دیکھ کر پہاڑوں کے شانوں پر برف کے آنچل خوشی سے لہرانے لگتے ہیں۔ نگاہیں اسے بار بار دیکھ کر تشنہ رہ جاتی ہیں۔ اللہ والوں نے بھی اسے جمالِ خداوندی کا بہترین مظہر قرار دیا ہے۔

اس کا کومل بدن فانوس کے پردوں کے اندر شمع کی مانند جھلکتا ہے اور اس کے اعضا کی تراش میں طلسمی کشش ہے۔ اس کی پیشانی چودھویں کے چاند کی سطح مرتفع معلوم ہوتی ہے، آنکھوں پر کاغان کی جھیلوں کا گمان ہوتا ہے، ابرو ہلالِ عید کا پیغام ہیں، پلکیں برگد کی شاخوں کی طرح گھنی ہیں، رخساروں کی ارغوانی ایسی کہ لعلِ یمن بھی شرما جائیں، دانت اتنے سفید کہ دُرِ عدن بھی ماند پڑ جائیں۔ سرخ لبوں پر آبِ حیات کا چشمہ موجزن ہے۔ گردن دیکھ کر گجرات کی صراحیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، سینے کا ابھار صبح کے دھندلکوں میں تاج محل کے میناروں کی مانند نظر آتا ہے۔ کلائیاں برہنہ شمشیروں کی طرح چمکتی اور بید مجنوں کی طرح لچکتی ہیں، ہاتھوں میں کشمیری دوشالے کی سی ملائمت ہے، ناخن چاند کے ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں، کمر یوں لہراتی ہے جیسے کوئی ناگن فیلڈ وغضب میں بل کھا رہی ہو، پاؤں ایرانی قالیچوں کی طرح گداز ہیں اور ان سب کی رکھوالی کے لیے کالی ریشمی زلفوں کے ناگ موجود ہیں۔

اس کے اندازِ تکلم میں جھرنوں کا ترنم ہے، مسکراتی ہے تو برق کوند جاتی ہے، ہنستی ہے تو پھول بکھیرتی ہے، محوِ رقص ہوتی ہے تو راجہ اندر کا دربار بے رنگ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس کی نگاہِ سرشار میں حشر تمیں خوابیدہ دکھائی دیتی ہیں اور اس کی انگڑائیاں ایمان کو غارت کر دیتی ہیں، بادِ نسیم اس کی سانسوں سے خوشبو پاتی ہے۔ کائنات کا ہر رنگین منظر بھلا دینے کے باوجود اس کی خوب صورتی فراموش نہیں کی جا سکتی۔"

بقیہ: نصرت محی الدین: چند یادیں

کے لحاظ سے پکا مسلمان تھا، اس کا ثبوت حسبِ ذیل واقعہ ہے:

ایک دن اچانک وہ اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر میرے گھر 'الحرا' آیا اور دونوں زن وشو نے اپنے سرج کی خوش خبری سنائی۔ یہ غیر متوقع خوش خبری سن کر میری اور میری بیوی آمنہ رحمٰن جامی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں نے بچوں کو دوڑا کر پھول اور مٹھائی منگوائی، دونوں کی گلپوشی کی اور منہ میٹھا کیا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہ سوجھا اس لیے کہ ایسی رسومات کا میں قائل نہیں ہوں، مگر ایسا کرکے مجھے اچھا لگا۔

اس سے ہٹ کر میں نے نصرت کو گلے لگایا اور میں نے اور میری بیوی نے دونوں کو ڈھیر ساری دعائیں دیں اور کہا:

خدا کی ترے ساتھ نصرت رہے
ہمیشہ ترے حق میں جنت رہے

■◆■

نصرت محی الدین: چند یادیں

رحمٰن جامی ('الحمرا' 12-2-830/7/، بل کالونی، قاری صاحب لین، مہدی پٹنم، حیدرآباد-28)

نصرت کو میں اس کے لڑکپن سے جانتا ہوں، وہ حقیقت میں ایک بڑے باپ کا بڑا بیٹا تھا، مخدوم دکن کے انقلابی شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے، ہندستان کے چوٹی کے ترقی پسند لیڈروں میں ان کا نام تھا، انھی کے فرزند اکبر کا نام نصرت محی الدین ہے۔ نصرت لڑکپن ہی سے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل پڑا جو ایک فطری عمل تھا، بقول ڈاکٹر زینت ساجدہ، نصرت کی گود میں بنی بنائی لیڈری آگری، ابھی وہ طالب علم ہی تھا کہ اسٹوڈنٹ یونین کی سرداری مل گئی، بات بات پر ہڑتالیں کروانا اس کا مشغلہ بن گیا۔

جب بینک کی ملازمت مل گئی تو نصرت نے بڑی دیدہ دلیری اور جرأت مندی کے ساتھ اپنی محبوبہ سے سب کے سامنے نہ صرف اپنے پیار کا اقرار کیا بلکہ اس سے شادی کا بھی کھلے عام اظہار کیا، ظاہر ہے شادی سے پہلے ہی مخالفتوں کا زبردست سامنا تھا اور اس نے بڑی پامردی سے اس کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہا، دوستوں کا خیال تھا کہ شادی کے بعد اس کی طوفانی محبت کم ہو جائے گی لیکن برخلاف اس کے بڑی حیرت و مسرت کی بات یہ تھی کہ اس محبت میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، اس وقت کامریڈ برادری میں برق یوسفی کی ناکام محبت کے بعد نصرت ہی کی شادی کو کامیاب و کامران قرار دیا گیا، ایک زمانے تک نصرت کی شادی کا چرچا رہا (برق یوسفی کا تذکرہ اس لیے بھی اہم ہے کہ نصرت محی الدین سے سب سے پہلی ملاقات برق یوسفی نے ہی کروائی تھی، جب کہ وہ ابھی طالب علم ہی تھا) برق کی محبوبہ کی بے وفائی کا سوگ منانے والے دوستوں میں ہمارے ساتھ وہ بھی تھا۔ نصرت لڑکپن میں بڑا شرمیلا شرمیلا سا لگتا تھا، ملے پلی میں باجی اجمال النساء کے گھر پر جو محفلیں جمتیں جن میں کامریڈوں، ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ہمارے قریبی دوستوں میں برق یوسفی، مظہر حسن موہانی (جو بہت خوب صورت کہانیاں لکھتا تھا، اور 'ملاپ' میں کام کرتا تھا) رگھوجی نرل بڑا اچھا ترنم تھا اس کا، صرف غزل کا شاعر تھا، مظہر حسن موہانی کے بڑے بھائی اور باجی جمال النساء سے چھوٹے اختر حسن پہلے پھر بعد میں اردو اکیڈمی کے قیام کے بعد اس سے وابستہ ہو گئے تھے، باجی کے اکلوتے فرزند اقبال دیگر احباب کے ساتھ رونق افروز رہتے۔ ان محفلوں میں نصرت بھی ہمارے آگے پیچھے رہتا اور ایک آواز پر دوڑا چلا آتا، ہر مشاعرے میں نصرت کی موجودگی ہمارے لیے سہولت کا باعث ہوا کرتی، زینت آپا (ڈاکٹر زینت ساجدہ، ہندوپاک کی نہایت منہ پھٹ مقرر اور حق گو ادیبہ) اپنے وقت کی مشہور ادبی انجمن 'اقلیم ادب' کی سرپرست تھیں، میں صدر تھا، پروفیسر مغنی تبسم اس کے معتمد، مصلح الدین سعدی اس کے مشیر تھے، مظفر مجاز، حامد مجاز، پروفیسر رحمت یوسف زئی، محسن رازی، سید لطیف محی الدین احمد (سابق ڈی سی پی او)، سعید صحرائی، سابق ڈپٹی کلکٹر)، قادر نوری، الکٹریکل انجینئر وغیرہ ہمارے ساتھی اور دوست تھے، زینت آپا کے گھر کوئی تقریب ہو، ادبی و غیر ادبی وہ فون کرکے بلوالیتیں۔ اس وقت ڈاکٹر حسینی شاہد اردو کے وسیلے سے اور زینت آپا کے شوہر ہونے کے ناتے سے ہم سب فطری طور سے ان کے قریب ہوتے چلے گئے، ڈاکٹر حسینی شاہد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے معتمد تھے اور ساتھ ہی انجمن اور اردو ہال کے تحت چلنے والے کالجس کے نگران بھی تھے، شروع ہی سے میں اور برق یوسفی زینت آپا ہی سے زیادہ قریب تھے لہٰذا ہم دونوں سے قریب کامریڈ یوسف تھے جو زینت آپا ہی کے گھر کے ایک حصے میں فروکش تھے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ مجھے اور برق یوسفی کو بہت چاہتی تھیں، لیکن یہ نشہ بہت جلد ٹوٹ گیا جب پتا چلا کہ ایک اور بھی ہے جس کا نام نصرت محی الدین ہے، اس زمانے میں زینت آپا کے پاس نصرت محی الدین کی آمد و رفت متواتر ہونے لگی تو لازمی طور سے نصرت بھی ہمارے قریب ہونے لگا اور رفتہ رفتہ بے تکلفی بھی بڑھنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نصرت اقلیم ادب کے سارے ہی احباب سے بے تکلف ہو گیا، اب اقلیم ادب اس کی ہو چکی تھی، کبھی کبھار مذاق دل لگی بھی ہو جایا کرتی تھی، کئی ایک انکشافات بھی ہوا کرتے تھے اور ہم ان باتوں سے لطف بھی اٹھاتے۔ ایک مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ لڑکیاں اب بھی اس پر مرتی ہیں، عوامی زندگی میں Social activities کے دوران ایسے سابقے پڑتے رہتے تھے جہاں نصرت کو طلاق و بہبود کیمپوں میں لڑکیوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا، جب ان لڑکیوں کو پتہ چلتا کہ نصرت نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ نانا بھی بن چکا ہے تو دریائے حیرت میں ڈوب ڈوب جاتیں، دوستوں کے ان انکشافات کے دوران نصرت صرف مسکراتا تھا۔

ایک دن نصرت نے اچانک اپنی نظموں کا پلندہ لاکر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا "میں آپ کی شاگردی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، ان نظموں کی نوک و پلک درست کر دیجیے، آج سے آپ میرے استاذ"۔ میں نے کہا بیٹا شاگردی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں، کوئی اتنی آسانی سے شاگرد نہیں بن جاتا۔ اس نے ایک انقلابی جذبے کے ساتھ پوچھا کہ بتائیے کیا آداب ہیں، مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہے۔ میں نے اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا "یہ تم اپنے بے تکلف دوست قدیر انصاری سے پوچھ لو وہ تمھیں بتادے گا" پھر اس کے بعد نصرت نے میرے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نصرت اصولوں کا پابند تھا، وقت کی اس کے پاس بڑی قدر تھی، سراپا اخلاق تھا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کو وہ اپنا فرض عین سمجھتا تھا۔ بے حد مخلص، دوستوں کی خبر گیری اور بیماروں کی مزاج پرسی اور دواؤں کی فراہمی میں ہمیشہ کوشاں تھا، بہ قول: اردو ہال کے رحیم خاں صاحب کے، اس نے کئی غریب اور مستحق لڑکوں کی ملازمتوں کے لیے جان توڑ کوششیں کیں اور ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا، اردو کی کئی تحریکیں چلائیں، اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل حل کرانے میں ہمیشہ پیش پیش رہا، کئی اردو کی نیم جان تحریکوں میں اس نے اپنی ہمت و دم سے دوبارہ جان ڈال دی اور انھیں بحال کرا کر چھوڑا، اس کی ایک مثال میرے سامنے انجمن ترقی اردو کی شاخ رائچور کی ہے، نصرت نے اس سلسلے میں یکے بعد دیگرے رائچور کے کئی دورے کیے، بالآخر اس نے اس میں جان ڈال کر ہی دم لیا، اسی طرح اردو مادری زبان والے کئی علاقوں میں گھوم پھر کر کام کیا۔

اکثر میرے ذاتی کام جو میں اپنے بے حد عزیز شاگرد قدیر انصاری سے لیا کرتا تھا (اللہ اس کو غریق رحمت کرے) جو کسی وجہ سے نہ ہو سکے وہ کام نصرت نے اپنی ذہانت، صلاحیت اور رواداری سے کام لے کر پورے کر دکھائے، اگرچہ قدیر انصاری کی کارکردگی کامیابی و کامرانی کی ضامن ہوا کرتی تھی۔

نصرت محی الدین کی اردو خدمات کا سہرا اکیلے نصرت کے سر نہیں باندھا جا سکتا اس میں ہمارے دوست اور بہی خواہ اور انجمن ترقی اردو کے موجودہ معتمد جناب محمد عبدالرحیم خاں کی سرپرستی اور ان کے تعاون کا بھی بے حد اہمیت ہے۔ نصرت کے اہم کارناموں میں امتحانات میں طلبہ کی دل و جان سے رہنمائی بھی شامل ہے، اس کی خدمات کے بے شمار کارنامے ہیں جو تفصیل طلب ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی سے اس کی قربت کی وجہ سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ عام کامریڈوں کی طرح نصرت بھی دہریہ ہوگا، یہ بات سراسر غلط ہے، وہ حقیقت۔۔

(بقیہ صفحے پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org